حضرت مولانا عبدالباری ندوی علیہ الرحمہ

بحیثیت مصنّف و فلسفی

پیدائش : ۱۴رذی الحجہ ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۱راگست ۱۸۸۸ء، بارہ بنکی

وفات : ۲۷رمحرم الحرام ۱۳۹۶ھ مطابق ۳۰رجنوری ۱۹۷۶ء، لکھنؤ

حضرت مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا وطن ضلع بارہ بنکی کا قصبہ ''گدیا'' تھا۔ مولانا نے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں آنکھیں کھولیں، آپ کا خاندان دنیاوی ثروت ووجاہت کے ساتھ دولتِ دین سے بھی بہرہ مند تھا۔ یعنی خوش حال بھی تھا، اور خوش مآل بھی۔ سنِ ولادت ۱۳۰۷ھ ہے۔

والد ماجد حضرت حکیم عبدالخالق علیہ الرحمہ اپنے زمانے کے ایک شیخِ کامل حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلیؒ نبیرۂ حضرت مُلّا نظام الدین سہالوی بانیٔ درس نظامی کے دست گرفتہ، مرید باختصاص اور خلیفۂ مجاز تھے۔ والدۂ ماجدہ ایک خداترس اور خدارسیدہ بی بی تھیں، جن کے مزاج وافتاد میں دین راسخ تھا، ان کے دینی احساسات کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے جو خود مولانا کے الفاظ میں یہ ہے:

> ''میں پونہ کے دورانِ ملازمت میں سالانہ تعطیل میں گھر اس حال میں آتا تھا کہ نماز صرف فرض پڑھا کرتا تھا سنتیں بالکل متروک تھیں۔ اور اب بالکل یاد نہیں کہ شامت کا باعث کیا تھا، تاہم ہفتہ دو ہفتہ کے بعد ہی سنتیں بھی پڑھنے لگا۔ تب والدہ ایک دن روتی ہوئی تشریف لائیں اور فرمایا کہ تم کو کیا ہوگیا تھا کہ تم

نماز پوری نہیں پڑھتے تھے؟ میں رو رو کر دن رات کی نماز میں دعا کرتی رہی، اور اب الحمدللہ یہ دیکھ کر کہ تم پوری نماز پڑھنے لگے ہو جان میں جان آئی۔" (۱)

للّٰہیت کہیے یا خدا ترسی دین کی حمیت اور عبادت کا یہ پاس و اہتمام رئیسانہ زندگی میں کم ہی لوگوں کو نصیب ہوا ہوگا، ورنہ عام طور پر تو یہی دیکھا گیا ہے کہ زمین داروں اور رئیسوں کے گھر کی دین داری چند رسومات تک محدود رہتی ہے۔ ملتِ بیضا کا بھرم غریبوں ہی کے دم سے باقی رہتا ہے، حضرت مولانا عبدالباری ندوی علیہ الرحمۃ کا خاندانی ماحول دنیاوی وجاہت کے ساتھ دین کا بھی پاس دار تھا۔ اور ایسے خدا ترس اور خدا رسیدہ والدین کی دعاؤں اور دینی فکرمندی کی آغوش تربیت میں خالقِ باری نے مولانا عبدالباریؒ کو پروان چڑھایا جو اُن کو ایک دن "شبستانِ قدم رسولؐ" تک لے گئی (۲)۔ قدم رسولؐ عبادت ہے اتباعِ رسولؐ سے، حبِّ رسولؐ سے، انقیاد و طاعتِ رسولؐ سے

پندار سعدی کہ راہِ صفا توان یافت جز از پئے مصطفیؐ

مولانا کو دنیاوی نعمت اور دین کی دولت وراثت میں بھی ملی تھی، اور وہبی اور اکتسابی راستے سے بھی عنایت ہوئی تھی۔ دنیاوی دولت تو معلوم نہیں کب تک رہی اور کب کم ہوئی۔ ظاہر ہے تقسیمِ وراثت اور خاتمۂ زمین داری کے بعد وہ بات نہیں رہی ہوگی جو اُن کے بچپن یا عہدِ شباب میں تھی۔ مگر اللہ نے اس کا نعم البدل ان کو بھرپور عطا فرمایا اور وہ زندگی بھر خوش حال اور معاشی لحاظ سے مطمئن و مسرور رہے۔ دینی احساسات کا جو تخم اُن کے والدین نے اُن کے دل و دماغ میں ڈالا تھا، وہ بہت بار آور ہوا، بڑھا، پھیلا اور ایک سایہ دار شجرِ پُرثمر بن کر دنیا کے سامنے آیا۔

---

(۱) مذہب اور سائنس سرگذشت ص: ۱۰

(۲) مولانا نے سیتاپور روڈ (لکھنؤ) پر ایک شان دار کوٹھی بنائی ہے جس کا نام شبستانِ سعادت تجویز فرمایا اور اس جوار میں "قدم رسولؐ" نام کی ایک زیارت گاہ بھی ہے، بعد میں دونوں کو جمع کر کے "شبستانِ قدم رسول" لکھنے لگے تھے۔ اس کوٹھی میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ بھی متعدد بار آرام فرما چکے ہیں۔ حضرت مولانا علی میاں مدظلہ نے "پرانے چراغ" میں اس کا تذکرہ بہت حسین پیرایۂ بیان میں کیا ہے، یہاں تلمیح اسی نام سے ہے۔ ع ع ن۔

مولانا کے وہبی واکتسابی کمالات کی تفصیل تو ایک مبسوط سوانح حیات ہی میں آسکتی ہے، لیکن اگر تفصیل واطناب کے بجائے اختصار وایجاز سے کام لیا جائے تو راقم الحروف جیسے بے بہرہ کو بھی چند واضح نشانات مل سکتے ہیں، جن کی طرف اشارہ اِن عنوانات سے کیا جاسکتا ہے:

ذہانت، ہمت، اور عزیمت:

مولانا کی ذہانت کا جب تک اظہار نہیں ہوا تھا، اُس وقت تک اُن سے کوئی بلند توقعات قائم نہیں ہوئی تھیں۔

ان کے والد ماجد نے ان کو ندوہ میں داخل کیا، اس وقت تک ندوہ میں نصابِ تعلیم سے منطق کی چند کتابیں حذف کردی گئی تھیں بقیہ نصاب وہی قدیم تھا جو یہاں بھی رائج تھا۔ پڑھانے والے بھی انھی مدارس کے تھے اس لیے اس ابتدائی دور میں ندوہ کا دار العلوم دوسرے مدارس کے درمیان کوئی امتیازی شان کے ساتھ سامنے نہیں آیا تھا، آج اس کی بین الاقوامی شہرت اور علمی ساکھ جس کا لوہا عالمِ اسلام نے مان لیا ہے وہ اس وقت نہیں تھا جب کہ مولانا عبدالباریؒ کو ان کے والد ماجد نے ندوہ میں داخل کیا تھا۔ لہٰذا ان کی ذہانت کے سوتے بھی کھل نہیں سکے تھے، مگر جب سیرت نگار نبوی علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمۃ نے ندوہ میں شرکت کی اور اس کے تعلیمی نظام کو اپنے ہاتھ میں لیا اس وقت سے بحث وتحقیق کا دور شروع ہوا، کتب بینی اور وسعتِ مطالعہ کا رجحان بڑھا، دعوتِ دین کو "عَلَّمَهُ الْبَيَانُ" کا زیور پہنایا گیا اس وقت مولانا عبدالباریؒ کو دوبارہ ندوہ میں داخل کیا گیا اور یہیں سے ان کے جوہر چمکے۔ مولانا شبلی نعمانیؒ کی مردم شناس نگاہ نے اس جوہر قابل کی تربیت کی، فلسفۂ قدیم کا مذاق پیدا کیا، علم الکلام کے کوچوں سے آشنا کیا۔ مولانا شبلیؒ کی تربیت پروان چڑھ کر مولانا عبدالباری ندوی کی ذہانت کی تلوار تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ مولانا نے اپنی ذہانت سے فلسفۂ قدیم کے بعد فلسفۂ جدید کا مطالعہ کیا۔ انگریزی کی استعداد بڑھائی، اور فلسفۂ جدید کے سمندر میں غوطے لگا کر اس کے نایاب موتیوں کو دین کے قدموں پر لاکر رکھ دیا۔ بہتر ہوگا اس اجمال کی

تھوڑی سی تفصیل حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی زبانی سن لی جائے:

''مولانا عبدالباری ندویؒ اس حقیقت کا زندہ ثبوت تھے کہ کامیابی اور ترقی کے لیے اصل شے ذاتی قابلیت، خداداد ذہانت اور اپنی محنت ہے۔ ان کے پاس ندوہ کے سوا کوئی سند نہ تھی، انگریزی بھی انھوں نے بقدر ضرورت بطور خود سیکھی تھی لیکن اپنی ذہانت اور قابلیت کے زور پر دکن کالج پونہ جو اس وقت نہ صرف جنوبی ہند بلکہ ہندوستان میں بڑا نام اور مقام رکھتا تھا، ان کا فارسی کے لکچرار کی حیثیت سے تقرر ہوا، اور انھوں نے بجائے فارسی یا اردو کے کلاس میں انگریزی میں لکچر دینا شروع کیا۔ وہ ''دیوانِ حافظ'' جیسی بلند اور پُراز تلمیحات ورموز'' کتاب کو انگریزی میں حل کر کے طلبہ کے سامنے پیش کرتے۔ ان کا یہ تجربہ بی۔اے میں بھی کام یاب رہا اور طلبہ ہر طرح سے مطمئن ہوئے اور کالج کے ایک ذہین طالب علم نے بڑے جوش واعتماد کے ساتھ کہا:

''اگر مولوی صاحب یہاں رہ گئے تو بمبئی پریسیڈنسی میں ان سے بہتر کوئی استاد نہ ہوگا۔''(۱)

ذہانت ہی سے ہمت کا بھی سوتا پھوٹتا ہے، مولانا نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک معلم کی حیثیت سے کیا۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنے استاذ جلیل علامہ شبلی نعمانیؒ کی وصیت وحکم کے مطابق دکن کالج پونہ کی تدریسی خدمات ترک کر کے اعظم گڑھ آکر بیٹھ گئے کہ سیرۃ النبیؐ کی تکمیل کریں تو پونہ کے لیے سید صاحب نے مولانا کی خواہش اور اپنی محبت کی بنا پر ان کا نام اپنی جگہ پیش کر دیا۔ دکن کالج میں مولانا کی کام یابی وکام رانی ونیک نامی کی تفصیل آپ نے ابھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے الفاظ میں سنی۔ جب پروفیسر شیخ عبدالقادر صدر شعبہ کا تبادلہ پونا سے بمبئی ہوا اور وہ ریٹائرڈ ہو گئے تو مولانا نے اپنا تبادلہ احمد آباد کرالیا۔ ان کے دورانِ قیام میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صدر الصدور امور مذہبی حیدرآباد سے ملاقات ہوئی، یہی ملاقات محبت وشفقت میں تبدیلی

(۱) پرانے چراغ حصہ دوم ص:۱۱۶

ہوئی۔ نواب مولانا شیروانی دیدہ ور بھی تھے اور مردم شناس بھی۔ وہ ان کو حیدرآباد لے جانے پر مُصر ہوئے۔ اور اس کی تمہید یہ ہوئی کہ مولانا نے گجرات کالج میں ایک تقریر فلسفۂ جدید پر کی، جس سے شیروانی صاحب اور تمام دانش ور ایسے متاثر ہوئے گویا مسحور سے ہوگئے۔ مولانا شیروانی علیہ الرحمۃ کے توسط سے مولانا کو علم الکلام پر ایک مستقل کتاب لکھنے کی پیش کش ہوئی، اور اس کا معاوضہ پیشگی دوسو روپئے [آج سے ۸۰/سال پہلے کے دوسو روپئے آج کے ۲/لاکھ سمجھیے] کے ساتھ دوسال تک اس فیلوشپ جاری رہنے کا پروانہ ملا، اور اس عرصہ میں یونی ورسٹی کے شعبۂ فلسفۂ جدید کے استاذ کی حیثیت سے تقرر ہو چکا تھا۔

مولانا کی اس علمی پرواز اور معاصرین کے درمیان اس عزت افزائی کو وہ لوگ کب برداشت کرسکتے تھے جن کے پاس فلسفہ کی اعلیٰ ڈگریاں تھیں، جن کی انگریزی دانی کا یہ حال تھا کہ چال انگریزی، ڈھال انگریزی، سر کے اندر ہر بال انگریزی، وہ ایک مولوی کو فلسفۂ جدید کے استاذ کی حیثیت سے دیکھ کر حیران بھی تھے اور اندر اندر رشک ورقابت سے سُلگ بھی رہے تھے۔ جب دوسال گزرنے کے بعد مولانا کی تقرری کے مستقل کیے جانے کا سوال اٹھا تو دربارِ نظام کے کسی حاضر باش نے نظام حیدرآباد کے کانوں تک یہ خبر پہنچادی کہ نواب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب نے فلسفہ کا استاذ ایک ایسے شخص کو بنادیا ہے جو فلسفۂ جدید کی کوئی سند نہیں رکھتا ہے۔ اور نہ انگریزی کی کوئی سند ہے، جس میں فلسفۂ جدید کا سرمایہ پایا جاتا ہے۔ قدرۃً اعلیٰ حضرت کی طرف سے یہ سوال کیا گیا کہ موصوف (یعنی مولانا عبدالباری ندوی) کے پاس کیا سندیں ہیں؟

اس کے جواب میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی صدر الصدور امور مذہبی نے مولانا کا رسالہ ''مذہب وعقلیات'' ایک عریضہ کے ساتھ ''پیش گاہِ ہمایونی'' میں گزارا، جس میں یہ لکھا تھا کہ ان کی یہ سند ہے کہ فلسفہ نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے، جس کا اندازہ سرکار خود رسالۂ ھٰذا کی چند سطروں کے ملاحظہ سے کرسکتے ہیں۔

مولانا کا یہ رسالہ ان کے دنیاوی عروج کا زینہ بنا، اور اس کے ساتھ دینی ترقیات کا بھی ذریعہ بنا۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس رسالہ کے بارے میں فرمایا:

''یہ مذہب کا آہنی قلعہ ہے۔''

مولانا اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اسی درمیان میں جب حضرت حکیم الامت کی جوتیوں تک رسائی ہوئی تو یہ رسالہ ملاحظہ کے لیے ان کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔

جواب حسبِ عادت ایجازی اور اعجازی یہ عطا ہوا کہ

''یہ مذہب کا آہنی قلعہ ہے۔''

راقم عاجز کو جتنی مسرت حضرت تھانویؒ کے ان دو لفظوں سے ہوئی شاید ہی کسی طویل سے طویل تنقید و تبصرہ سے ہوئی ہو۔''

اسی رسالہ پر حضرت مخدوم و مربی مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی مدظلہ نے جو تحریر فرمایا، اس کو بھی حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ نے نقل کیا ہے، لکھتے ہیں:

''اب اوّلاً و آخراً ہمارے حضرت علی میاں سلمہم کی قدردانی وقدرافزائی ان کی کتاب ''محسن کتابیں'' کے آخر میں ملاحظہ ہو:

مولانا پر وہ غلبۂ حال تھا کہ عصر حاضر کی تمام تر الجھنوں، مشکلات، ماڈی، علمی وروحانی مصائب کا حل شفاخانۂ تھانہ بھون سے حاصل کرنے کی ترغیب دیتے رہے، اور اگر ان کتابوں کا سنجیدگی سے، عصبیت وخودرائی سے بے نیاز ہو کر مطالعہ کیجیے تو بات معقول اور برمحل نظر آئے گی صرف یہ ملحوظ رہے کہ مولانا عبدالباری ندوی نے حصر سے کام نہیں لیا ہے کہ نجات کا ذریعہ اور مشکلات کا حل صرف اور صرف اسی راہ میں ہے جس کے نقوش حضرت تھانویؒ نے چھوڑے ہیں۔ مولانا کا منشا یہ ہے کہ علم و تجربہ، قدیم و جدید کے مطالعہ سے یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ حضرت تھانویؒ کا طریقہ ایک بہترین سہل الوصول، اور اقرب ترین راستہ ہے، اس میں نہ کسی ''سلسلہ'' کا انکار ہے اور نہ کسی ''طریقہ'' کی نفی۔ جہاں تک

حصر وقصر کا تعلق ہے وہ صرف اسوۂ رسولؐ کو حاصل ہے۔ راقم سمجھتا ہے کہ اس نکتہ کی وضاحت ضروری تھی، کیوں کہ حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کی جب یہ کتابیں نکلی ہیں اس وقت مجھے یاد ہے بعض ایسے اہلِ قلم نے جن کا علمی سلسلۂ نسب دیوبند ہی سے ملتا ہے، اس پر معترض تھے اور اعتراض کا نشانہ یہی تھا کہ مولانا عبدالباری صاحب طریقِ تھانوی کے علاوہ ہر طریقہ کو ناقص اور قابلِ اصلاح سمجھتے ہیں، حالاں کہ بات قطعاً ایسی نہیں تھی اور نہ ہے۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کی عظمت کا نشان ہمیں اس بات میں نظر آتا ہے کہ وہ اپنے اوّلین استاذ ومحسن علّامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمۃ کی عزت وعظمت کے ہمیشہ قائل رہے، حضرت تھانویؒ سے تعلق سے پہلے جس جوش ومحبت سے ان کا تذکرہ کرتے، ان کے احسانات گناتے، اسی طرح اس تعلق کے بعد بھی اپنے استاذ ومحسن کا ذکر کرتے جنھوں نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا اور ان کی انگلیوں میں قلم کی گرفت مضبوط کی۔ یہی حال نابغۂ علوم اسلامیہ علّامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا جنھوں نے حیاتِ شبلی میں اپنے استاذ گرامی کے احسانات شمار کرائے ہیں۔ (ملاحظہ ہو مقدمہ حیات شبلی کی آخری سطریں) مولانا عبدالباری اپنے استادوں اور محسنوں کو کبھی نہیں بھولے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا نام ''قدردان اعظم'' کے لقب سے لیتے ہیں۔ علّامہ شبلی کا نام ''حضرت استاذ علّامہؒ'' لکھتے ہیں۔ مولانا شیر علی حیدرآبادی جنھوں نے مولانا کو شرح حکمۃ الاشراق پڑھائی تھی، ان کا ذکر بھی محبت واکرام کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کے معاصرین اور مخلصین وبے تکلف احباب میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ، ہر ایک کا پاس ولحاظ آخر عمر تک قائم رکھا۔ سید صاحب کو سید الطائفہ کہتے، مولانا دریابادیؒ کو ''مفسر دریا آبادی'' کہتے۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ ان تینوں حضرات اور مولانا دریابادی اور مولانا مسعود علی ندوی کی آپس کی دوستی وفا واخلاص کا نمونہ تھی۔ آپس میں بے تکلفی بھی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے جو مکاتیب مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے نام چھپے ہیں، ان میں سید صاحب

جب مولانا عبدالباری ندوی صاحب کا ذکر کرتے تو بجائے پورا نام لینے کے ''مولانا عباری'' لکھتے، یہ ایک طرح 'اختصاریہ' Abbriviatain تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے خاندانی ماحول میں ماجد میاں کہے جاتے تھے۔ سید صاحب اور مولانا مسعود علی ندوی غایتِ قرب کی بناپر ان کو اسی مختصر نام سے یاد کرتے تھے (جس کی وجہ سے شبلی منزل اعظم گڑھ سے وابستہ سب لوگ یا اکثر حضرات ماجد میاں ہی کے نام سے مفسر دریابادی کا حوالہ دیتے ہیں) اور مولانا مسعود علی ندوی کو سپہ سالار مسعود غازی کی رعایت سے ''غازی صاحب'' کے نام سے مکاتیب میں کئی جگہ یاد کیا گیا ہے ایک دوسرے کے انتہائی قدرداں، اور ہر طرح کا پاس ولحاظ رکھتے تھے۔ اس کی مثال نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ رحمة الله عليهم رحمة الأبرار الصالحين.

حضرت مولانا عبدالباری ندوی اپنی اخوان الصفا میں ممتاز درجہ رکھتے تھے، وہ اپنے ہم چشموں اور معاصرین ہی کا احترام نہیں ملحوظ رکھتے بلکہ اپنی عمر سے بہت ہی خورد شخصیات کا نام بھی بسا اوقات اس درجہ احترام سے لیتے کہ گویا وہ اپنے کسی بڑے کا ذکر کر رہے ہیں ''انکارِ ذات'' یا ''شکستِ اَنا'' کا یہ بھی ایک مظہر تھا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ مولانا سے عمرو تجربہ میں برادرِ خورد کا درجہ رکھتے تھے، مولانا عبدالباری صاحب کی دوستی اور معاصرت ان کے برادرِ بزرگ حضرت مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ سے تھی، وہ ندوہ میں اس وقت کے طالب علم تھے جب حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کے والد ماجد حضرت مولانا سید عبدالحی حسنیؒ نائب ناظم تھے، لیکن حضرت مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا ظرف دیکھیے اور ان کا یہ بڑا پن "Greatness" تھا کہ وہ مولانا سید ابوالحسن علی میاں کا ذکر محبت واحترام کے ایسے الفاظ سے کرتے ہیں کہ حضرت مولانا علی میاں مدظلہ کو لکھنا پڑا:

> ''مجھ سے بعض اوقات اس طرح پر اپنے تاثر کا اظہار فرماتے کہ میں ندامت سے پانی پانی ہو جاتا۔''(۱)

---

(۱) پرانے چراغ حصۂ دوم ص: ۱۲۸

حلیہ ولباس:

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے علمی وروحانی درجات کے ساتھ جسمانی وجاہت بھی عطا کی تھی۔ کشیدہ قامت، کھلتا ہوا گندمی رنگ، باوجاہت، متناسب الاعضاء جسم وچہرہ، فراخ آنکھیں، نہایت جامہ زیب، لباس سادہ لیکن آراستہ، اودھ کے دین دار شرفاء اور رؤساء کا انداز، شیروانی کے تمام بٹن لگے ہوئے، سلجھی ہوئی سفید شرعی داڑھی، چال میانہ، آواز نہ پست اور نہ بلند، میانہ روی ہر بات سے ظاہر ہوتی تھی۔

مرضِ وفات:

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے حضرت مولانا عبدالباری علیہ الرحمہ کے مرضِ وفات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> "مولانا پر شدید بیماریوں کا حملہ تو پے در پے ہوا، متعدد آپریشن بھی ہوئے لیکن ۱۹۷۱ء سے مکمل طور پر صاحبِ فراش ہوگئے اور ذہنی صلاحیتیں اور جسم تعطل کا شکار ہوگیا۔ یہ طویل مدت سعادت مند فرزندوں اور تیمارداروں کے لیے صبر آزما اور ان کے لیے رفعِ درجات اور تکفیر سیئات کا ذریعہ بنی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس طویل عرصہ میں ان کے گھر کے لوگ ان کی بیماری یا معذوری سے کبھی نہیں اکتائے۔ وہ ہمیشہ ان کی درازیٔ عمر کی دعا کرتے رہے۔ اور بڑی مستعدی وفرض شناسی کے ساتھ خدمت کی۔"

مولانا نے ۳۰ رجنوری ۱۹۷۶ء کو بروز جمعہ عالم ناسوت سے عالم بقا کی طرف کوچ کیا۔ ان کی وصیت کے مطابق مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی مدظلہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ اور اپنے محلہ کے قبرستان ڈالی گنج میں آسودۂ خاک ہوئے۔

آل اولاد:

حضرت مولانا عبدالباری علیہ الرحمۃ کی دو صاحبزادیاں ہیں جو ماشاء اللہ صاحبِ

اولاد ہیں، چار صاحب زادے ہوئے، بڑے جناب شمس الباری صاحب نے پاکستان (لاہور) میں اقامت اختیار کی، دوسرے صاحب زادے الحاج مولوی فضل الباری صاحب ہیں جو گھر بار کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں، اس سال حج کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ اپنے والد نام دار کی سنت میں ایک خوبصورت مسجد اپنے خرچ سے تعمیر کرائی ہے جس میں ملحق ایک تحفیظ القرآن کا مدرسہ بھی قائم کیا ہے، جس کو اپنے ذاتی خرچ سے چلا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ رفاہِ عام کے کاموں میں حسبِ استطاعت حصہ لیتے ہیں۔ ندوہ سے ان کا ذاتی اور موروثی دونوں تعلق ہے اس کی اہم خدمات میں حصہ لیتے ہیں، چند سال پہلے اپنے زیر انتظام جانفشانی سے انھوں نے ایسا ٹیوب ویل اور واٹر ٹینک تیار کر دیا جس سے ندوہ کی پوری بستی جو ڈھائی ہزار نفوس سے آباد ہے سیراب ہو رہی ہے جزاہ اللہ۔ ان کے شریکِ کار اور معاون ان کے تیسرے بھائی الحاج احمد الباری صاحب ہیں جو متعدد بار حج اور بے شمار عمرے کر چکے ہیں۔ چوتھے بھائی عبید الباری صاحب ہیں جو آسام میں ایک اچھے عہدہ پر فائز ہیں۔ (۱)

تصنیفات، تالیفات اور ترجمات:

۱۔ مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے ان کو علمی و دینی دنیا میں متعارف کرایا وہ ان کا رسالہ ''مذہب اور عقلیات'' ہے، اس رسالہ کو دیکھ کر حضرت تھانویؒ نے فرمایا تھا ''اسلام کا آہنی قلعہ ہے۔'' اور جس کو مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ نے اپنی محسن کتابوں میں شمار کیا ہے، یہی وہ کتاب ہے جس کو نواب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی علیہ الرحمۃ نے حضور نظام کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا تھا کہ

---

(۱) افسوس کہ حافظ احمد الباری صاحب نے لکھنؤ ۱۰ر صفر ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۰ر اکتوبر ۲۰۱۹ء کو طویل علالت کے بعد وفات پائی، رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً، بڑے صاحبزادے شمس الباری صاحب پاکستان ہجرت کر گئے تھے، وہاں وفات پائی، فضل الباری صاحب اور عبید الباری صاحب نے چند گھنٹوں کے فرق سے ۷ر رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ مطابق ۲۰ر اپریل ۲۰۲۱ء کو لکھنؤ میں وفات پائی۔ اور اپنے عظیم القدر والد ماجد کے پاس ڈالی گنج قبرستان میں مدفون ہوئے، رحمھم اللہ تعالیٰ أجمعین.

''سائنس نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے۔''

۲۔ ''مبادی علوم انسانی'' یہ کتاب برکلے کی کتاب **Principles of Human Knowledge** کا کامیاب ترجمہ ہے۔

۳۔ برکلے کی سوانح اوراس کا فلسفہ، مولانا نے ڈی کارٹ سے لے کر ڈیوڈ ہیوم تک کی تمام کتابوں کو خصوصیت سے پڑھا اوران سب کا نچوڑ جو انگریزی کے مآخذ میں ملا سب پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ یہ دونوں کتابیں دارالمصنفین سے شائع ہوئی ہیں۔

حضرت مولانا کا تعلق حکیم الامت مولانا تھانویؒ سے تقریباً پندرہ سال رہا۔ اس تعلق وارادت مندی نے ان پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ تمام معاشی ومعادی مسائل کو حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کے ملفوظات وارشادات، مواعظ اور اصلاحی کتابوں کے ذریعہ حل کرنے کے داعی ومنادی بن گئے۔ ان کی وفات کے بعد چار کتابیں اس سلسلہ کی لکھیں جو حسب ترتیب یہ ہیں:

(ا) ''جامع المجد دین'' (تجدید دینِ کامل) جب یہ کتابیں ۱۹۵۰ء میں چھپیں تو حضرت تھانویؒ کے حلقہ سے اس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی قدس سرہٗ نے اس پر ایک جامع عالمانہ ومحققانہ مقدمہ لکھا، جس میں مجدد دین اسلام کی مختصر تاریخ بیان فرمادی اور دکھایا کہ تاریخ اسلام میں کس کس کو مجدد کہا گیا ہے اور کب کب کہا گیا ہے۔ حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ نے اس کتاب میں حضرت تھانویؒ کے تجدیدی کارناموں کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ایک طرح سے تعلیمات وارشاداتِ تھانویؒ کا انسائیکلوپیڈیا ہے البتہ اس کتاب کے نام ''جامع المجدد دین'' پر اہلِ علم کو اعتراض رہا ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ ''جامع المجدد دین'' تو اللہ کی صفت ہوسکتی ہے کہ قیامت کے روز تمام مجددوں کو یکجا کردے گا، اور مجددین پر کیا موقوف ہے انبیاء، صلحاء اور عام بندے سب کا جامع وہی ہے۔ وھو علیٰ جمعھم إذا یشآء قدیر۔ مولانا نے غالباً اس طرح کے اعتراضات کی بنا پر اس کا نام بدل کر ''تجدید دینِ کامل'' کردیا تھا۔ لیکن سچ پوچھیے تو

اعتراض بے جا تھا۔ یہ اردو کی عربی نما ترکیب ہے جس کا مطلب واضح ہے کہ تمام مجدّدین میں جو صفات وخصوصیات تھیں آپ ان کے جامع تھے، جیسے نعت کا مشہور شعر ہے ؎

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اس طرح مجددینِ سلف میں کسی نے تزکیہ قلب کے اندر مقام امتیاز پایا۔ کسی نے اصلاحِ نفس میں کارہائے نمایاں انجام دیا۔ کسی نے تعلیم وتربیت میں اختصاص حاصل کیا لیکن حضرت تھانویؒ نے تنہا ان تمام گوشوں کو اُجاگر کیا۔ مولانا نے کتاب کا نام بدل کر یہ واضح کردیا کہ ان کے اندر صرف اصلاح کا جذبہ تھا وہ لفظی موشگافیوں سے بچنا چاہتے تھے، ورنہ اپنی بات پر اَڑ سکتے تھے اور اصرار کرسکتے تھے کہ ان کا تجویز کردہ نام غلط نہ تھا۔

(۲) اس سلسلہ کی دوسری کتاب ہے ''تجدیدِ تصوف وسلوک'' یہ کتاب ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۹ء میں مصنف علیہ الرحمۃ کے زیر اہتمام نامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا مقدمہ بھی حضرت علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا ہے جس کا عنوان ہے ''حقیقتِ تصوف کے مکتشفِ اعظم اور فنِ احسان وتقویٰ کا مجددِ کامل۔'' جس میں دکھایا گیا ہے کہ حضرت تھانویؒ بہ یک وقت حافظ، قاری، مدرس، مفسر، محدث، فقیہ، واعظ، صوفی، متکلم، مناظر، ناظم، ادیب اور خانقاہ نشین شیخ سب کچھ تھے۔ مصنف نے اس حقیقت کو کھول کر بیان کیا ہے کہ تصوف کے اوپر جو اشراقی فلسفہ، مسیحی مراقبات، اور جوگیانہ ریاضیات کے دھبے داغ پڑ گئے تھے، حضرت تھانویؒ نے ان سب کو دھو کر احسانؔ وتقوے کی اصلاؔ روح خالص کتاب وسنت کی روشنی میں نمایاں کردی اور تصوف عین کمالِ ایمان کا نام ہے اور اس کا علم ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ اور بغیر صوفی بنے دینی، دنیوی، انفرادی واجتماعی، قومی وسیاسی برکات وثمرات سے ہم کنار ہونا ناممکن ہے۔

مولانا نے اس کتاب میں تصوف کی حقیقت یہ بتائی ہے کہ ''یہ فقہ باطن ہے'' جو

فقہ ظاہر سے زیادہ اہمیت کا مستحق ہے۔ اذکار واشغال کی کیا حقیقت ہے۔ مجاہدات کا کیا مطلب ہے۔ بیعت وارادت کیوں اور کس حد تک اور کس منزل پر ضروری ہے۔ عشق ومحبت کا دعویٰ بغیر عملِ صالح کے لغو ہے، امانت کا اصل مفہوم کیا ہے؟

غرض اس کتاب میں اصولی باتیں ہیں جن کو ملفوظات اور مکاتیبِ تھانویؒ سے استفادہ کر کے مرتب کیا گیا ہے۔ تقریباً پانچ سو صفحہ پر یہ کتاب پہلی مرتبہ چھپی تھی۔

(۳) تیسری کتاب ''تجدید تعلیم وتربیت'' ہے۔ اس میں سب سے پہلے انسان کے اسلامی تصور کو واضح کیا گیا ہے، جو قرآن وسنت سے مستنبط ہے۔ اس کے مقابلہ میں فلاسفۂ یوروپ نے جو کہا ہے اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جو مولانا کا خاص مضمون تھا۔ اس کتاب میں تعلیم، مقصدِ تعلیم، طریقِ تعلیم، حاصل تعلیم اور تعلیم کے غلط نتائج اور اس کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے دینی تعلیم وتربیت کے گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مدارس کے نظام، اسناد کی تقسیم، علماء کی غفلت اور اس کے مہلک نتائج بھی کھول کر بیان کیا ہے۔ استدلال زیادہ تر حضرت تھانویؒ کے ملفوظات وارشادات سے ہے۔ اور درس وتدریس، تعلم وتعلیم، وظیفہ وچندہ کے ذکر میں ماحول اسلامی تعلیمات کے مدرسوں کا ہے۔

(۴) اس سلسلہ کی چوتھی کتاب ''تجدید معاشیات'' ہے۔ اس کے صفحات بھی ۵۱۸ رہیں اور اس سلسلۂ تجدیدیات کی آخری کڑی ہے جو ۱۹۵۵ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ اس کے ابواب کے نام سے بحث وتحقیق کا رُخ متعین ہوجاتا ہے۔ ''معاشیاتِ عبدیت'' اس میں معاشیات کی اسلامی اساس آیت کریمہ ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ مَآ أُرِيْدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَآ أُرِيْدُ أَنْ يُطْعِمُوْنَ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنِ.'' کی تشریح کرتے ہوئے یہ دکھایا ہے کہ عبدیت کا تقاضا یہ ہے کہ معاش کو اللہ کی ذمہ داری اور عبادت کو اپنا فرض سمجھے، وسائل معاش مقصد حیات سے الگ کر کے تلاش نہیں کیے جاسکتے۔ یہ بہت اعلیٰ اور باریک مضمون ہے کہ وسائلِ معاش

کے حصول کے ذرائع سے انکار نہیں لیکن عبدیت یہ ہے کہ مقصد کے منافی وسائل اور مقصد کی برابری سے زیادہ وسائلِ رزق پر قبضہ نہ کیا جائے۔

دوسرا باب ہے ''معاشیاتِ مشیت'' اس میں توحید کا مطلب، توحید مشیت، علت ومعلول کی حقیقت، تدابیر کا درجہ، محض فکری ونظری عیاشی سے نفرت ''فظلتم تفکھون'' سے استدلال، معاشی تنگی وفراخی کا مقصود واضح کیا گیا ہے۔

تیسرا باب ہے ''معاشیاتِ انفاق'' احادیث جن میں کسبِ حلال کی ترغیب دی گئی ہے ان کا مطلب، ربّنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة کی صحیح تفسیر حضرت تھانویؒ کے الفاظ میں، معاش معاد سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، انسانی فطرت کا تقاضہ، انسان کی نامحدودیت، کسب وتدبیر کے حدود۔

اس طرح کے سیکڑوں ذیلی عناوین قائم کرکے مولانا نے حضرت تھانوی کے مواعظ ومکاتیب اور ارشادات سے پورا نظام معیشت مرتب کردیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مولانا نے معاشیات کے مروجہ فن پر نہیں بلکہ معاشیات کی نئی تشکیل پیش کی ہے، اس لیے ابواب وفصول اس طرح کے نہیں ہوسکتے تھے جو اس فن پر لکھی ہوئی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے حضرت تھانویؒ کے تجدیدی یا مجددانہ انداز فکر میں ڈھالا ہے، اور یہ ایک اہم کارنامہ ہے۔ مولانا کے نزدیک ''انسان'' اور مقامِ آدمیت اور مقصدِ حیات کلیدی عنوانات ہیں۔ اس لیے سب کچھ انسان کے لیے ہے تو خود ''انسان'' کی حقیقت اور اس کی ضرورت سے بات شروع کی جائے۔

یہ چار کتابیں تو حضرت تھانویؒ کی مجددانہ تربیت کا نچوڑ ہیں، اگرچہ یہی سب کچھ نہیں ہے۔ مولانا کے ذہن میں اس سے زیادہ وسیع کام تھا کہ تفسیر بیان القرآن کے لیے علاحدہ حمائل کی شکل میں شائع کیا جائے۔ اسی طرح مواعظ وملفوظات کو عام امت کے لیے مختلف عنوانات کے تحت مختصر کرکے شائع کیا جائے۔ یہ سب کام تو ایک طویل مدت اور

ایک جماعت کے کرنے کا تھا۔ جس سے کچھ کام دوسرے انداز میں مکمل بھی ہوئے ہیں، لیکن حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کی یہ چار کتابیں دو ہزار صفحوں میں پھیلی ہوئی ہیں دراصل کئی ہزار صفحوں کا نچوڑ ہیں۔

مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہما میں کئی باتیں مشترک تھیں، دونوں ندوہ اور علامہ شبلیؒ سے وابستہ تھے، سیرۃ النبی کی تالیف میں بھی سید صاحب کے ساتھ مولانا کا تعاون رہا، چناں چہ معجزات کا پورا باب مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے قلم سے لکھا ہوا ہے اور ان کے نام کی تصریح مقدمہ میں موجود ہے۔

مولانا کی یوں تو تمام تصنیفات ہیرے جواہرات میں تولنے کے لائق ہیں، کیوں کہ وہ سب ان کے گہرے مطالعہ، مشاہدہ، احساسات کا نتیجہ اور اخلاص وتقوے اور امت کی اصلاح کے جذبہ سے لکھی گئی ہیں۔ انھی کتابوں میں ''نظام صلاح واصلاح'' بھی ہے جو دراصل سورۂ والعصر کی تفسیر ہے، تفسیر سے زیادہ تفہیم ہے اور تفہیم سے زیادہ تبلیغ مدنظر ہے۔ یہ ۳۸۷ صفحات پر مشتمل کتاب جو معقولات ومنقولات کی جامع ہے اور تذکیری پہلو اور اصلاحِ حال کی دعوت جس کی روح ہے، پہلی مرتبہ مجلس علمی کراچی سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی تھی۔

ان کتابوں کی آخری کڑی ''مذہب وسائنس'' ہے جو مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی درخواست پر انھوں نے مرتب فرمائی اور جس کو مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوہ نے شائع کیا، اس کی ابتدا میں مولانا کے قلم سے ان کی سوانح کی جھلکیاں بھی ہیں۔

مولانا کی جن تالیفات کے نام ہمیں حاصل ہوسکے وہ یہ ہیں:

۱۔ مبادیِ علم انسانی

۲۔ برکلے اور اس کا فلسفہ

۳۔ علم اخلاق

۴۔ مقدمہ مابعد الطبیعات

۵۔ اخلاقیات (ترجمہ)

۶۔ حدیقۂ نفسیات

۷۔ طریق وتفکرات

۸۔ فلسفۂ انتائجیت

۹۔ فہم انسانی

۱۰۔ عملی نباتیات

۱۱۔ تجدید تصوف وسلوک

۱۲۔ جامع المجددین (تجدید دین کامل)

۱۳۔ تجدید تعلیم وتبلیغ

۱۴۔ تفسیر سورۂ والعصر (نظام صلاح واصلاح)

۱۵۔ تجدید معاشیات

۱۶۔ نظام تعلیم واصلاح

۱۷۔ مضامینِ معارف

۱۸۔ بین التصوف والحیاۃ (ترجمہ عربی)

۱۹۔ مذہب اور عقلیات

۲۰۔ مذہب وسائنس

مولانا کے علوم ومعارف کی یہ چند جھلکیاں ہیں، اور ابھی اس بحر میں باقی ہیں کتنے لولوئے لالا۔

کتبہٗ الفقیر الی رحمۃ ربہ

عبداللہ عباس الندوی

نزیل لکھنؤ ۵ر ربیع الانور ۱۴۱۴ھ